بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دنیانظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست

رحمۃ للعالمینی انتہاست

عزیزانِ گرامی قدر، سلام ورحمت:

یہ ہماری کس قدر خوش بختی ہے کہ ہمیں پھر ایک بار اس تقریبِ مبارک ومسعود میں شرکت کا موقعہ ملا ہے جو وجہِ شرفِ انسانیت اور باعثِ نورانیتِ عالم ہے۔ مبداءِ فیض کی اس کرم گُستری پر ہم اس کی بارگاہ میں جتنے سجودِ تشکر و نیاز بھی ادا کریں، کم ہیں اور پھر یہ حقیقت بھی کس قدر وجہٗ شادابیٔ قلب ونظر ہے کہ یہ تقریب اس موسمِ بہار میں آئی ہے جس میں زندگی تازہ شادمانیوں کی نمود کا پیغام لیے ہر شجرِ کائنات سے انگڑائیاں لیتی ہوئی بیدار ہوتی ہے۔۔۔عیدِ میلاد النبی ﷺ کی تقریب اور بہار کا موسم، کیسا حسین وجمیل ہے یہ امتزاج!

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، اس تقریبِ سعید پر بارگاہِ رسالتمآب ﷺ میں میرے نذرانۂ عقیدت کا عنوان ہے ''دنیا نظامِ محمدی ﷺ کے لیے بیتاب ہے''۔ اس موضوع تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ ایک رسول کا فریضۂ زندگی کیا ہوتا ہے؟ چونکہ ہمارے ہاں اسلام، دین کی حیثیت سے نہیں، مذہب کی شکل میں مروّج ہے، اس لئے عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ رسول بھی محض وعظ ونصیحت کے لیے تشریف لاتے تھے اور لوگوں کو اخلاقی اصلاحات کی ترغیب دے کر اپنا فریضہ ادا کر جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ رسول افرادِ معاشرہ کی اخلاقی تہذیب کا فریضہ بھی سرانجام دیتے تھے، لیکن یہ چیز مقصود بالذّات نہیں ہوتی تھی۔ یہ ایک ارفع واعلیٰ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتی تھی اور وہ مقصد ہوتا تھا انسانوں کی تمدّنی، تہذیبی، ثقافتی، عمرانی،

معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی میں انقلاب برپا کرنا۔علامہ اقبالؒ نے اپنے مجموعۂ خطبات کے پانچویں خطبہ میں رسول ﷺ کے اس فریضہ کو بڑی جامعیت سے واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

فریضۂ رسالت ﷺ:

''محمد عربی ﷺ، فلک الافلاک کی بلندیوں پر پہنچ کر واپس تشریف لے آئے۔خدا شاہد ہے کہ اگر میں اس مقام پر پہنچ جاتا تو کبھی واپس نہ آتا''۔یہ الفاظ ایک بہت بڑے صوفی بزرگ (عبدالقدوس گنگوہیؒ) کے ہیں۔تصوّف کے تمام لٹریچر میں ان جیسے اور الفاظ کا ملنا غالباً مشکل ہے، جو ایک فقرے کے اندر شعورِ نبوّت اور تصوّف کے اس قدر لطیف نفسیاتی فرق کو اس طرح واضح کردیں۔ایک صوفی اپنے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ سے واپس آنا نہیں چاہتا اور جب واپس آتا بھی ہے (اس لئے کہ اسے واپس آنا پڑتا ہے) تو اس کی یہ مراجعت نوعِ انسانی کے لئے کچھ معنی نہیں رکھتی۔اس کے برعکس، ایک نبی کی مراجعت تخلیقی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔وہ آتا ہے کہ زمانے کے طوفان پر تسلط پا کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں لے آئے اور اس طرح مقاصد کی ایک نئی دنیا تعمیر کردے۔ایک صوفی کے لئے اس کے انفرادی تجربہ کی تجردگاہ آخری مقام ہوتی ہے، لیکن ایک رسول کے دل میں اس سے زلزلہ انگیز نفسی قوتیں بیدار ہوجاتی ہیں، جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام دنیائے انسانیت میں ایک انقلاب پیدا کریں۔یہ آرزو کہ جو کچھ اس نے دیکھا ہے وہ ایک جیتی جاگتی دنیا کے پیکر میں متشکل ہوجائے، نبی کے دل میں پیش پیش ہوتی ہے۔اسی لئے ایک صاحبِ وحی کے تجربہ کی قدروقیمت جانچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیکھا جائے کہ اس نے انسانیت کو جس قالب میں ڈھالا ہے، وہ کیسا ہے اور اس کے پیغام کی رُو سے جس قسم کی دنیائے ثقافت اُبھر کر سامنے آگئی ہے وہ کس انداز کی ہے۔''

میں اس وقت ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ تصوّف کی حقیقت کیا ہے اور جنہیں صوفی

کے مقامات کہا جاتا ہے، ان کی ماہیت کیا۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جس فریضۂ رسالت کی وضاحت کی ہے، وہ کس قدر اہم ہے اور اس سے رسول، دیگر مصلحین، مبلغین اور واعظین سے کس قدر ممتاز اور منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنے اس عظیم فریضہ کو کس حسن وخوبی سے سرانجام دیا، کما حقہ، سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک ہم یہ نہ دیکھیں کہ ظہورِ نبوی ﷺ کے وقت دُنیائے انسانیت کی حالت کیا تھی؟ اس کے لیے ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے، ایک غیر مسلم محقق کی شہادت پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ (Denison) ایک ممتاز مؤرخِ تہذیب ہے۔ اس نے اپنی کتاب (Emotion as the Basis of Civilisation) میں اس زمانے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> اس وقت (ظہور اسلام کے وقت) ایسا دکھائی دیتا تھا کہ تہذیب کا وہ قصرِ مشیّد جو چار ہزار سال میں جا کر تعمیر ہوا تھا، منہدم ہونے کے قریب پہنچ چکا ہے اور نوعِ انسانی پھر اس بربریت کی حالت کی طرف لوٹ جانے والی ہے جہاں ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا اور آئین وضوابط کو کوئی جانتا تک نہ تھا۔ قدیم قبائلی آئین اپنی قوت واحترام کھو چکے تھے، اس لئے اب ملوکیت کے اندازِ کُہن کا سکّہ دنیا میں نہیں چل سکتا تھا۔ عیسائیت نے جن آئین ودساتیر کو رائج کیا تھا، وہ نظم وضبط اور وحدت ویکجہتی کے بجائے تشتّت وافتراق اور ہلاکت وبربادی کا موجب بن رہے تھے۔ غرضیکہ وہ وقت آ چکا تھا جب ہر طرف فساد ہی فساد نظر آتا تھا۔ تہذیب کا وہ بلند وبالا درخت جس کی سرسبز اور شاداب شاخیں کبھی ساری دنیا پر سایہ فگن تھیں اور آرٹ، سائنس اور لٹریچر کے زرّیں ثمرات سے بہرہ یاب ہو چکی تھیں، اب لڑکھڑا رہا تھا۔ عقیدت واحترام کی زندگی بخش نمی اس کے تنے سے خشک ہو چکی تھی اور وہ اندر تک سے بوسیدہ اور کھوکھلا ہو چکا تھا۔ سلسلۂ حرب و ضرب کے طوفان نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے تھے اور یہ ٹکڑے صرف رسوماتِ پارینہ کے بندھن سے ایک جگہ قائم تھے لیکن ان کے متعلّق ہر وقت خطرہ تھا

کہ نہ معلوم کب گر پڑیں۔

اور اس کے بعد وہ کہتا ہے:

کیا ان حالات میں کوئی ایسا جذباتی کلچر کہیں سے پیدا کیا جا سکتا تھا جو نوعِ انسان کو ایک مرتبہ پھر ایک نقطہ پر جمع کر دیتا اور اس طرح تہذیب کو مٹنے سے بچا لیتا؟ اس کلچر کو بالکل نئے انداز کا ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ پرانی رسومات اور آئین وضوابط سب مردہ ہو چکے تھے اور انہی جیسے اور آئین کا مرتب کرنا صدیوں کا کام تھا۔

یہ امر موجبِ حیرت واستعجاب ہے کہ اس قسم کا نیا کلچر سرزمینِ عرب سے پیدا ہوا اور اس وقت پیدا ہوا جبکہ اس کی اشد ضرورت تھی۔

علامہ اقبالؒ نے عالمِ انسانیت کی اس حالت کو اپنے مخصوص انداز میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بند ہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر بحرِ یک نخچیر، صد نخچیر گیر

مفہوم: اس دنیا میں انسان، انسان کی پوجا کیا کرتا تھا۔ وہ مَا، مِٹا ہُوا اور غلامی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ ایران اور روم جیسی بڑی سلطنتوں کے بادشاہ (انسانیت کے حق میں) ڈاکو تھے اور انہوں نے اس کے ہاتھ، پاؤں اور گردن کو مضبوطی سے باندھا ہُوا تھا کاہن، مذہبی پیشوا، حکمران اور امیر لشکر و فوج غرض شِکار ایک (انسانیت) اقور شکاری ہزاروں تھے۔(م۔س۔ا)

محدّث دہلوی شاہؒ ولی اللہ نے اسی ضمن میں کہا تھا:

چونکہ ہمارے نبی اکرمؐ کے زمانے میں اقوام کے اندر معاشی ومعاشرتی فسادات پیدا ہو چکے تھے اور ان کی اقتصادی زندگی سخت خراب ہو چکی تھی اس لئے حضور ﷺ کو ان خرابیوں کے استیصال کے لئے مبعوث فرمایا گیا اور آپؐ کے ہاتھوں رومی اور ایرانی

ملوکیتوں کو برباد کرایا(جو ان ناہمواریوں کا سرچشمہ تھیں)

(تفہیماتِ الٰہیہ، جلد اوّل،ص:66)

عالمگیر رسالت:

یوں تو خدا کا ہر رسول اسی قسم کے انقلاب کا داعی ہوتا تھا، لیکن حضرات انبیائے علیہم السلام سابقہ اور حضور نبی اکرم ﷺ میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ازمنۂ گذشتہ میں چونکہ آبادیاں محدود ہوتی تھیں اور وسائلِ مواصلات اور ذرائع رسل ورسائل عام نہیں تھے، اس لئے ایک رسول ﷺ کا دائرہ اثر ونفوذ ایک خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن حضور نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جو عصرِ قدیم اور دورِ حاضرہ کے (درمیان) حدِّ فاصل تھا۔ اب دنیا کی آبادیوں نے محدود نہیں رہنا تھا، انہیں پھیل کر ایک عالمگیر معاشرہ بن جانا تھا۔ اس لئے حضورؐ کی بعثت نہ کسی خاص قوم کے لئے مخصوص تھی نہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود۔ حضور ﷺ تمام نوعِ انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سورہ الاعراف میں ہے قل یایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً (7:158، 3: 17، 3: 79)۔ اے رسول! تم تمام نوعِ انسان کو مخاطب کر کے کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ دوسری جگہ ہے۔ وما ارسلنك الا كافة للناس بشيرا وانذيرا (32:28) ''اے رسول (ﷺ)! ہم نے تمہیں پُوری کی پُوری انسانیت کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔'' اس پُوری کی پُوری انسانیت سے مراد صرف حضورؐ کے زمانہ کا عالمِ انسانیت نہیں تھا بلکہ اس میں قیامت تک آنے والے انسان سب شامل تھے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے کہ، ہم نے ان لوگوں کی طرف اپنا رسول بھیجا جن کی طرف رسول نہیں تھا، یہ ان کی طرف بھی رسول تھا آخرین منھم لما یلحقوا بھم (66:3) ''جو ان کے بعد آنے تھے۔'' ظاہر ہے کہ ان کے بعد آنے والوں میں تمام دنیا کے قیامت تک کے انسان شامل تھے۔ یہ وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے جہاں خدا کے متعلق کہا کہ وہ ''رب العالمین'' (1:1) ہے۔ اس کی کتاب کے متعلق کہا کہ وہ ذکر للعالمین (38:87) ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے متعلق کہا کہ آپ ﷺ ''رحمۃ للعالمین'' (21:107) ہیں اور

اس کی شہادت یہ کہہ کردی کہ جو کتاب اس رسول (ﷺ) کی طرف بھیجی گئی ہے وہ وتمت کلمة ربك صدقاً وعدلا لامبدل لکلماۃ (6:115) ''ہر طرح سے مکمل ہے، آخری کتاب ہے۔غیر متبدل ہے اور اس میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کرسکتا۔'' یہ اس کتاب کی خصوصیت تھی اور جو انقلاب اس کتاب کی رُو سے برپا ہونا تھا اس کی عالمگیریت کی طرف یہ کہہ کر (اشارہ) کردیا کہ هوالذی ارسل رسولهٔ بألهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون۔(61:9) ''اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ضابطۂ ہدایت اور مبنی برحقیقت نظام دے کر بھیجا تا کہ وہ نظام دیگر تمام نظام ہائے عالم پر غالب آجائے۔خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے جو متفرق نظاموں کے تحت رہنا چاہتے ہیں۔خدائے واحد کے نظامِ واحد کو پسند نہیں کرتے۔''

انقلابِ محمدی ﷺ:

اس انقلاب کی وسعت حدود نا آشنا تھی، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا آغاز بہرحال اس خطہ زمین سے ہونا تھا جس میں حضورؐ کی بعثت ہوئی تھی۔اس انقلاب سے وہاں کس قسم کی تبدیلی رُونما ہوئی اس کے متعلق بھی ہم غیر مسلم مفکرین کی شہادات پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔(Pringle Kennedy) ہمارے دور کا ایک مشہور فلاسفر ہے۔وہ لکھتا ہے:

> ''چند ہی سال کے عرصہ میں یہ نقشہ کس طرح بدل گیا۔کس طرح 650ء تک یہ دنیا اس دنیا سے یکسر مختلف ہوگئی جو اس سے پہلے تھی، نوعِ انسانی کی تاریخ میں یہ باب ایک نمایاں خصوصیت کا حامل ہے۔''

(Arabian Society at the time of Muhammad P.18)

کارلائل اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے:

> ''عربوں کے لئے یہ انقلاب ایک نئی زندگی تھی جو انہیں تاریکی سے نُور کی طرف لے آئی تھی۔عرب اس کے ذریعہ پہلی دفعہ زندہ ہوا۔ایک ایسی قوم جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کے عالم میں ریوڑ چراتی پھرتی تھی، ان کی طرف ایک

رسول آیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ قوم ایمان لے آئی۔ وہ دیکھو! وہی گمنام چرواہے دنیا کی ممتاز ترین قوم بن گئے۔ وہ حقیر قوم ایک عظیم الشان ملت میں تبدیل ہوگئی۔ ایک صدی کے اندر اندر عرب ایک طرف غرناطہ اور دوسری طرف دہلی تک چھا گئے۔ اس کے بعد سینکڑوں برس ہو چکے ہیں کہ یہ اسی شان وشوکت اور درخشندگی وتابندگی سے کرۂ ارض کے ایک حصہ پر مسلّط ہیں (یہ سب ایمان کی حرارت سے ہوا)۔ ایمان بہت بڑی چیز ہے۔ ایمان ہی سے زندگی ملتی ہے۔ جونہی کسی قوم میں ایمان پیدا ہوا، اس قوم کی تاریخ، اعمال میں نتائج اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والی بن گئی۔

''وہ عرب۔۔۔ یہ محمد ﷺ۔۔۔ اور ایک سو سال کا عرصہ! کیا یہ انقلاب ایسا ہی نہیں جیسے ریت کے کسی سیاہ گمنام ٹیلے پر آسمان سے بجلی کی لہر آ گرے اور وہ ریت کا تودہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک آتش گیر مادے میں تبدیل ہو کر اس طرح بھک سے اُڑ جائے کہ دہلی سے غرناطہ تک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے؟''

''نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارہ کے انتظار میں تھی۔ وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل ﷺ کی صورت میں آسمان سے آیا اور تمام نوعِ انسانی کو شعلہ صفت بنا گیا۔''

(Heroes and Hero Worship. Page:66)

ممتاز تاریخ دان گبنؔ اس باب میں کہتا ہے:

''محمد ﷺ کا مذہب شک وابہام سے بالکل مبرّا ہے اور قرآن، خدا کی توحید کی درخشندہ شہادت، نبی عربی ﷺ نے بتوں، انسانوں اور اجرام سماوی کی پرستش کو اس بصیرت افروز دلیل کی بنا پر ردّ کر دیا کہ جو طلوع ہوتا ہے وہ غروب بھی ہوتا ہے۔ جو پیدا ہوتا ہے، وہ مرتا بھی ہے۔ جس کی بنیاد میں فساد ہے اس کا مال ہلاکت اور تباہی ہے۔ آپ کے دینی جوش اور ولولہ نے جو یکسر مبنی علی البصیرت تھا،

خالقِ کائنات کی صورت میں، اس لا انتہا ذاتِ سرمدی کا اقرار کر کے اسے مرکزِ حمد وستائش قرار دے دیا، جو صورت اور مکان کی جہت سے بلند اور اولاد اور مثیل کی نسبتوں سے بالا تھی۔ وہ ذات جو ہمارے پوشیدہ خیالات تک میں موجود اور خود اپنی ذات سے قائم ہے، اور جس کے سرچشمہ سے عقل واخلاق کے جوہروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ مسلکِ توحید اس قدر بلند ہے کہ ہماری موجودہ استعداد کی وہاں تک رسائی نہیں ہوسکتی۔

جو چیز ہمارے لئے سب سے زیادہ وجہ حیرت ہے، وہ اسلام کی اس قدر جلد اشاعت نہیں، بلکہ یہ کہ اس کی تعلیم کس قدر ابدی حقائق پر مبنی ہے۔ وہی سادہ لیکن مکمل نقش جو محمد عربی ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں انسانی قلوب پر مسکوک کیا تھا اور جو ان بارہ صدیوں کے انقلاب کے باوجود ہندوستان سے افریقہ تک قرآن کے متبعین کے ہاں محفوظ چلا آتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہب اور عقیدہ کے مقصود کو عام انسانی حواس وتخیل کی سطح پر اُترنے نہیں دیا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، اسلام کا نہایت سادہ اور غیر متبدّل عقیدہ ہے۔ ان کا خدائی تصوّر کبھی بھی مرئی ہستیوں کا شرمندہ نہیں ہوسکا۔ رسول اللہ ﷺ کا درجہ کبھی بشریت کی حد سے تجاوز نہیں کرسکا۔ ان کی زندہ تعلیمات نے ان کے متبعین کے جذباتِ عقیدت کو دین و دانش کے حدود سے باہر نہیں جانے دیا۔ یہ ہے اسلام کی سادہ اور ابدی تعلیم۔

(Gibbon-Decline & Fall of Roman Empire Page: 287 & 352)

اور بریفا کہتا ہے:

''یورپ کی نشاۃِ ثانیہ پندرہویں صدی میں نہیں ہوئی، بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا۔ یورپ کی خلقتِ جدیدہ کا گہوارہ اٹلی نہیں، بلکہ اُندلس ہے۔ اِدھر روما کی تہذیب، گرتے گرتے، بربریت کی حد تک پہنچ چکی تھی اور اُدھر دنیائے اسلام (بغداد، قرطبہ، قاہرہ) تہذیب وذہنی تحریکات کے مرکز بن

رہے تھے۔ ان ہی شہروں میں وہ نئی زندگی نمودار ہوئی جسے انسانی ارتقاء میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا۔ جس وقت یہ نئی تہذیب محسوس طور پر سامنے آئی، دنیا حیاتِ نو سے شناسا ہوئی۔۔۔ اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کرسکتا تھا، جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلندترین سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔ مغربی کلچر میں کوئی ایسا شعبہ نہیں جس میں عربی ثقافت کا رنگ نہ جھلکتا ہو۔ لیکن ایک شعبہ تو ایسا ہے جس میں یہ اثر بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی وہ شعبہ ہے جو درحقیقت عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا باعث اور اس کی فتوحات کا ذریعہ ہے۔ یعنی علم الاشیاء۔۔۔ سائنس کی روح!۔ ہماری سائنس صرف اسی حد تک عربوں کی رہین منّت نہیں کہ انہوں نے ہمیں عجیب وغریب نظریات وانکشافات سے روشناس کرایا۔ نہیں! بلکہ ہماری سائنس کا وجود ہی ان کا شرمندہ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا، درحقیقت زمانۂ قبل از سائنس (Pre-Scientific Age) ہے۔ پندرہویں صدی تک یورپ انہی علوم وفنون کو اپناتا رہا جو اُسے مسلمانوں نے دیئے تھے، اس پر کوئی اضافہ نہ کرسکا۔۔۔ جب اُندلس میں تہذیب وثقافت نے پھر تاریکیوں کی چادر اوڑھ لی تو یورپ میں وہ جِن نمودار ہوا جسے اُندلس کی سرزمین نے پیدا کیا تھا۔ یورپ کو زندگی (صرف سائنس نے دی۔ اسلام کے گوناگوں اثرات اس کی حرارت کا موجب ہے۔''

(Briffult - Making of Humanity)

ہم چاہتے تو اس باب میں اس قسم کی بیسیوں اور شہادات بھی پیش کی جاسکتی تھیں لیکن ہم سرِ دست انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد ہمیں خود اپنے زمانہ کی طرف آنا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ دنیا اس نظام کے احیاء کے لئے کس قدر تڑپ رہی ہے، جو سرزمین عرب میں قائم ہوا تھا۔

اس کے بعد؟:

حضور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں اس عظیم انقلاب کی بنیاد رکھی گئی اور حضور ﷺ کے سچے

جانشینوں نے اس عمارت کو استوار کیا۔ ان کے بعد آنے والوں نے اپنی مساعی کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا، جس سے دین، مذہب میں بدل گیا اور اس انقلاب کی وہ شکل بھی باقی نہ رہی۔ میں اس حقیقت کو بار بار وضاحت سے بیان کر چکا ہوں کہ نظامِ خداوندی جن قوانین کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے وہ ازلی اور ابدی ہیں اور فطرت کے قوانین کی طرح ہر وقت کارفرما رہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس وقت کوئی ایسی جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس نظام کو عملاً متشکل کرنے کا تہیہ کرتی ہے، وہ قوانین چند دنوں میں محسوس نظام کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی جماعت باقی نہیں رہتی تو پھر وہ اپنی رفتار سے غیر محسوس طور پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، لیکن یہ رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ ان قوانین کے اپنے رفتار سے کارفرما رہنے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی فکر اور عقل کی رُو سے اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین اور متشکل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اس کے نتائج بتاتے ہیں کہ وہ نظام وجۂ اطمینان نہیں ہوسکتا۔ پھر وہ اسے چھوڑتا ہے او رکوئی دوسرا نظام وضع کرتا ہے۔ انہی تجرباتی طریقوں سے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب وہ کسی نظام کو کسی حد تک بھی اپنے لئے قابلِ اطمینان پاتا ہے تو اس نظام کا رُخ اسی منزل کی طرف ہوتا ہے جسے قرآنِ کریم نے عالمگیر انسانیت کے لئے تجویز کیا ہے۔ اس وقت دنیا میں ایک ہمہ گیر شورش برپا ہے۔ انسانوں نے اپنے تجرباتی طریق کی رُو سے صدیوں کے منازل طے کرنے کے بعد اس وقت جو نظام وضع کئے ہیں وہ انہیں قابلِ اطمینان نہیں پا رہا اور کسی ایسے نظام کے لئے تڑپ رہا ہے جو اس کے لئے وجہ سکون اور باعثِ فلاح وفوز بن سکے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس وقت دنیا میں جو اہم بنیادی نظام مروّج ہیں، کیا انہیں اقوامِ عالم نے اطمینان بخش پایا ہے اور اگر ایسا نہیں تو ان کے ذہن میں اس نظام کا تصوّر کس قسم کا ہے جو ان کے نزدیک وجۂ طمانیت بن سکتا ہے۔

نظامِ حکومت:

جو نظام قرآنِ کریم کی رُو سے حضور نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں متشکل ہوا تھا اس کی

بنیاد اس اہم حقیقت پر تھی کہ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کر سکے۔خواہ وہ حکومت لاقانونیت کی رُو سے ہو یا انسانوں کے خودوضع کردہ قوانین کے مطابق۔ وہ ان دونوں شکلوں کو غلامی سے تعبیر کرتا ہے۔اس غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے اس نے اعلان کیا کہ:

ماکان لبشر ان یوتیه الله الکتب والحکم والنبوة ثم یقول للناس کونوا عبادالی من دون الله ولکن کونوا ربانین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون۔(3:78)

''کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اسے ضابطۂ قوانین یا زمامِ اقتدار حتیٰ کہ نبوّت بھی کیوں نہ حاصل ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں میرے محکوم، مطیع اور فرماں بردار بن جاؤ۔اسے یہی کہنا چاہئے کہ تمہیں اس کتابِ خداوندی کے مطابق، جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو، اور اس پر غور وفکر کرتے رہتے ہو، خدا کے محکوم بن جانا چاہئے۔''

اس آیۂ جلیلہ میں نظری طور پر ہی نہیں کہا گیا کہ تم خدا کے محکوم بن جاؤ، اس کا عملی طریقہ بھی بتادیا اور وہ یہ کہ خدا کے محکوم بننے سے مُراد یہ ہے کہ تم اس کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرو(دیکھیے 5:44، 5:48)۔خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرنے سے مُراد یہ ہے کہ انسانوں کو۔۔۔خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کی جماعت۔۔۔قانون سازی کا حق حاصل نہیں۔ حکومت کا فریضہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کرنا ہے نہ کہ خود قوانین وضع کرنا۔ یہ تھا وہ عملی طریق جس سے قرآنِ کریم نے نوعِ انسان کو صحیح آزادی کا منشور دیا۔صدرِاوّل کے بعد یہ نظام نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور انسانوں نے عقل کے تجرباتی طریق کی رُو سے اپنے لئے نظامِ حکومت خودوضع کرنا شروع کر دیا۔صدیوں کے تجربات کے بعد اب وہ اس نظام تک پہنچے ہیں جسے سیکولر نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عملی ذریعہ مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظام اطمینان بخش ثابت ہوا ہے۔اس کے لئے خود مغربی مفکرین کی آراء ملاحظہ فرمایئے۔(مثلاً فرانسیسی

مفکر (Rene- Guinn) لکھتا ہے:

جمہوری نظام:

اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کریں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے اور جو نہ کبھی پہلے وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی جمع بین النقیضین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔۔۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں، ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کر دیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کے خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رُو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے خاص رُخ پر لگایا بھی جا سکتا ہے اور بدلا بھی جا سکتا ہے۔

(Crisis of the Modern World)

جمہوری نظام کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ اکثریت کے فیصلے حق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس باب میں پروفیسر ایلفر ڈ کوبن لکھتا ہے کہ:

”یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو، نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔“

پروفیسر کوبنؔ نے کہا ہے کہ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے؟ اس کے لئے خود مغربی مفکرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انسانوں کو قانون سازی کا حق حاصل ہی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ان کے فیصلے ہر حالت میں

صحیح نہیں ہو سکتے۔ فرانسیسی مفکر (Betrand De Jouvenel) نے ایک مشہور کتاب لکھی ہے (Sovereignty) وہ اس میں کہتا ہے کہ:

''بہ ادنیٰ تعمق یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اگر آپ ایک دفعہ اس اصول کو تسلیم کر لیں کہ انسانی مرضی اور ارادے کو اقتدارِ مطلق حاصل ہو سکتا ہے تو اس کے بعد جو نظامِ حکومت بھی قائم ہوں گے، حقیقت کے اعتبار سے وہ سب ایک جیسے ہوں گے۔ نظامِ ملوکیت اور جمہوری نظام، بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اس اصول کی رُو سے دونوں کا شعوری قالب ایک ہی ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو، یہ اصول اسے یکساں حقِ مطلق العنانی عطا کر دیتا ہے۔'' (ص:199)

اسی حقیقت کو امریکی ماہرِ آئین ایڈورڈ کارون اپنی کتاب (The Higher Law) میں بڑی وضاحت سے سامنے لاتا ہے۔ وہ اس میں مشہور مقنن (Cicero) کے الفاظ نقل کرتا ہے:

حقیقی قانون، مبنی بر حکمت اور فطرت سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ فضا میں ہر جگہ پھیلا ہوا، غیر متبدّل اور ابدی ہوتا ہے۔ یہ قانون معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے۔ یہ مملکت کا مقدس فریضہ ہے کہ کوئی ایسا قانون نافذ نہ کرے جو اس قانون کے خلاف ہو۔ اسے اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اس میں کسی قسم کی ترمیم کرے نہ ہی وہ اسے منسوخ کر سکتا ہے۔ نہ ہی ہماری پارلیمان نہ ہی سینٹ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ لوگوں کو اس قانون کی قید سے آزاد کر دے۔۔۔ نہ ہی اس قانون کی کیفیت یہ ہے کہ روما کے لئے الگ قانون ہو اور ایتھنز کے لئے الگ۔ ایک قانون آج ہو اور دوسرا کل۔ یہ ایک ازلی، غیر متبدّل قانون ہے جو ابدی طور پر تمام اقوام کو اپنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ (ص:10)

یہ اقدار و قوانین کہاں سے ملیں گے اس کے متعلق ہمارے دور کا سب سے بڑا سائنس دان آئن سٹائن کہتا ہے کہ:

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاسکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقلِ انسانی پر نہیں ہوتی لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اُترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔

نظامِ عدل:

حکومت کا بنیادی منصب، نظامِ عدل کا قیام ہے۔ قانون کی دنیا میں عدل سے مُراد ہوتا ہے مروجہ قوانین کے مطابق فیصلے کرنا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ قوانین ہی حق پر مبنی نہ ہوں تو ان کے مطابق فیصلوں کو عدل کیسے کہا جائے گا؟ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ خود اقوامِ مغرب کے مفکرین کے نزدیک انسانوں کو قوانین وضع کرنے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔ بنا بریں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلے عدل کہلا ہی نہیں سکتے۔ صرف قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے عدل کہلا سکتے ہیں۔ (Emil Brunner) ہمارے دور کا فلسفۂ قانون کا بہت بڑا ماہر ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:

> جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لئے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے، ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابلِ قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حقِ مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔ (Justice and the Social Order)

آپ نے غور فرمایا کہ عصرِ حاضر کا انسان اپنے وضع کردہ نظامِ حکومت کے ہاتھوں کس

قدر تنگ آچکا ہے۔اس کے نزدیک وہی نظامِ حکومت موجب اطمینان اور مبنی برصداقت کہلا سکتا ہے جو قوانین خداوندی کے نافذ کرنے کا ذریعہ ہو۔ وہ ان قوانین کی تلاش میں بُری طرح سرگرداں پھر رہا ہے۔

نیشنلزم:

قرآنِ کریم نے آج سے چودہ سوال پہلے یہ اعلان کیا کہ کان الناس امت واحدۃ (2:213)''تمام نوعِ انسان ایک عالمگیر برادری ہے، اس لئے اسے مختلف قبیلوں، نسلوں اور قوموں میں تقسیم کر دینا جہنم کی تباہی لانے کے مترادف ہے۔حضور نبی اکرم ﷺ نے اس اصول کے مطابق ایسی اُمت تشکیل فرمائی جو رنگ، نسل، زبان، وطن کی، انسانوں کی خودساختہ حدود و امتیازات کو مٹا کر نظریہ کی وحدت کی بنیادوں پر قائم ہوئی۔ یہی انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کی مبنی برحقیقت شکل تھی اور اس کا نتیجہ وہ جنّت جو یک رنگ وہم آہنگ انسانوں کے اجتماع سے وجود میں آتی ہے۔لوگوں نے اس تصوّر کو فراموش کر کے نیشنلزم کا نظریہ وضع کیا۔ اسے عمل میں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے تباہ کن نتائج کے ہاتھوں مغربی مفکرین چیخ اُٹھے ہیں۔

(مثلاً) پروفیسر میسن اپنی کتاب (Creative Freedom) میں لکھتا ہے:

> جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے، جس طرح افراد میں باہمی تنازعہ کی بنیاد جذبۂ انانیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اس بنیاد سے لگ سکتا ہے۔

برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ:

> ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوعِ انسان کی تباہی کے لیے سب سے بڑی قوت ہے، (پھر تماشہ یہ کہ) ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے۔ لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔
>
> (The Hopes for a Changing World)

وہ اس کے بجائے کس قسم کا نظام چاہتے ہیں اس کے متعلق بھی انہوں نے اب بڑی

وضاحت سے کہنا اور لکھنا شروع کر دیا ہے۔ مثلاً کیتھولک چرچ کا راندۂ درگاہ پادری (Tielard - de - Chardin) جس کی کتابوں کو کلیسا نے اس کی زندگی میں شائع نہیں ہونے دیا تھا، اپنی کتاب (Building of The Earth) میں لکھتا ہے:

> اب اقوام کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اگر ہم نے ہلاکت سے بچنا ہے تو کرنے کا کام صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے قدیم تعصّبات کو ختم کر دیں اور (مختلف ملکوں اور خطوں کی حدود سے آگے بڑھ کر) خود کرۂ ارض کی تعمیرِ نو کا انتظام کریں۔ انسان کو اس کی موجودہ پستی سے نکال کر بلندیوں کی طرف لے جانے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے دعوتِ انسانیت کا راستہ۔ اب شعورِ انسانی کے لئے ضروری ہے کہ وہ خاندان، وطن اور نسل کی تنگ ناؤں سے آگے بڑھ کر پوری نوعِ انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کا پروفیسر (Hugh Miller) اپنی کتاب میں جس کا نام ہی اس نے (The Community of Man) رکھا ہے، لکھتا ہے:

> تہذیب کا فریضہ ہے کہ وہ پھر سے اس انسانی برادری کا احیاء کرے جو انسانی زندگی کی ابتداء میں موجود تھی، لیکن جو بعد میں عارضی طور پر خاندانوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹ گئی۔ تہذیب کہا ہی اسے جاسکتا ہے جو انسانوں کو باہم دِگر جوڑ دے۔ انسانی ارتقاء کا اگلا قدم ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونا چاہئے جو تمام نوعِ انسان پر مشتمل ہو۔

(Gunner Myrdal) سویڈن کا مشہور ماہر اقتصادیات ہے وہ کہتا ہے کہ:

> یہ حقیقت ہے کہ ہمارے یہ بلند مقاصد اسی صورت میں حاصل ہو سکیں گے جب ایک ایسی دنیا وجود میں آجائے جس میں نہ کرّۂ ارض پر کھینچی ہوئی ممالک کی لکیریں ہوں اور نہ ہی قوموں کے خود وضع کردہ حدود۔ یہ دنیا وہ ہوگی جہاں انسان جہاں جی چاہے، آزادانہ چلے پھرے، رہے سہے اور ہر جگہ یکساں شرائط پر اپنے لئے حصولِ مسرّت کر سکے۔ سیاسی طور پر اس سے مُراد تمام دنیا کی واحد حکومت ہوگی او

رجمہوری طور پر یہ تمام انسانوں کے باہمی مشورہ سے اپنا کاروبار سرانجام دے گی۔

اس کے بعد یہ مفکر لکھتا ہے:

ہم اپنی روح کے مذہبی نشیمن میں کسی ایسی ہی حسین دُنیا کا تصوّر محسوس کرتے ہیں جس میں کامل ہم آہنگی اور یکجہتی ہو۔

مشہور امریکی مفکر (Lewis Mumford) لکھتا ہے کہ تہذیب درحقیقت اس عملِ پیہم اور غیر مختتم کا نام ہے جو ایک دنیا، اور اس میں بسنے والی ایک انسانی برادری، کی تشکیل کرے۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

اگر ہم نے اس عملی وحدت کو مزید التوا میں رکھا تو اس کا نتیجہ عالمگیر تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مغربی انداز معاشرت کا کھیل کھیلا جا چکا ہے اور یہ تمدّن بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔۔۔ اب دنیا کو ایک ایسے بطلِ جلیل کی ضرورت ہے جو اس کلچر اور تاریخ کی تمام حدود کو توڑ دے جنہوں نے انسان کو اپنے اندر قید کر رکھا ہے اور اس طرح اس کی نشوونما کے راستے میں بری طرح حائل ہو رہی ہیں، اس بطلِ جلیل کی ضرورت، جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر، وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جائے۔

(Transformation of Man)

اگر ان مفکرین کے سامنے اسلام کی صحیح تاریخ ہوتی تو انہیں نظر آجاتا کہ وہ بطلِ جلیل جو کاروانِ انسانیت کو موجودہ تباہی کے ویرانوں سے نکال کر وحدتِ انسانیت کے عالمگیر نظام کی طرف لے جا سکتا ہے، چودہ سو سال ہوئے نبی آخر الزماں ﷺ کی شکل میں دنیا میں آیا تھا اور اس نے اس وحدت کو عملاً قائم کر کے دکھا دیا تھا۔ وہ بطلِ جلیل ﷺ آج اپنے انسانی پیکر میں دنیا میں موجود نہیں لیکن وہ ضابطۂ حیات، جس کے مطابق اس نے اس وحدت کو قائم کیا تھا لفظاً لفظاً دنیا میں موجود ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم عالمگیر انسانیت کی وحدت چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔

معاشی نظام:

ہمارے دور کو، دورِ اقتصادیات (Age of Economics) کہا جاتا ہے۔ اس دور میں انسان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس نے کمیونزم یا سوشلزم جیسا اقتصادی نظام وضع کیا ہے۔ اس نظام کے اسقام ونقائص کے متعلق میں اتنا کچھ لکھ چکا ہوں کہ اس وقت اس کے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر 1975ء میں میرے ایک خطاب کا عنوان تھا ''جہاں مارکس ناکام رہ گیا اس سے آگے''۔ اس میں مَیں نے بڑی وضاحت سے بتایا ہے کہ خود مارکسؔ نے اپنے تصوّر کے نظام کے عملاً متشکل کرنے کے لئے کس طرح اپنے عجز کا اظہار کیا اور اس کے بعد میں نے یہ لکھا ہے کہ اس کے تصوّر کا نظام، حضور نبی اکرم ﷺ نے کس طرح متشکل کر کے دکھا دیا تھا اور وہ آج بھی قرآن کی روشنی میں کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے۔ میں اس وقت صرف ایک نکتہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا اور وہ یہ کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے نظامِ سرمایہ داری کے علمبرداروں کو واشگاف الفاظ میں یہ وارننگ دی تھی کہ اگر تم نے اس نظام کو نہ بدلا تو ایک وقت آئے گا جب یہ پسماندہ، مفلس، نادار، محنت کش تنگ آ کر تمہارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبیں گے۔ اسے حضور ﷺ نے ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا تھا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

> کچھ لوگ ایک کشتی میں سوار ہوئے۔ ان میں سے کچھ اُوپر کے حصے میں پہنچ گئے اور کچھ نچلے حصہ میں رہے۔ جو نچلے حصہ میں تھے وہ پانی لینے کے لئے اُوپر گئے تو اُوپر والوں نے انہیں یہ کہہ کر پانی لینے سے روک دیا کہ اس سے انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ نیچے والوں نے کہا کہ بہت اچھا، ہم نیچے کشتی میں سوراخ کر کے پانی لے لیں گے۔ اب اگر نیچے والوں کو، پانی دے کر اس سے نہ روکا گیا تو ظاہر ہے کہ نیچے اور اُوپر والے سب غرق ہو جائیں گے۔ اگر انہیں پانی دے کر اس سے روک دیا جائے تو سب بچ جائیں گے۔ (ترمذی)

حضورؐ نے سرمایہ داروں کو یہ وارننگ چودہ سو سال پیشتر دی تھی۔ آپ دیکھئے کہ آج یہ کس

طرح حرفاً حرفاً صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والے شہرہ آفاق مجلہ (Time) نے اپنی 22 دسمبر 1975ء کی اشاعت میں ایک مبسوط مقالہ شائع کیا جس کا عنوان تھا۔ ''کرّہ ارض کا ایک نیا تصادم''۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت دنیا کی حالت یہ ہے کہ اس کے قریب 75 کروڑ باشندے ساری دنیا کے ذخائر کو غصب اور ہضم کر کے بیٹھ گئے ہیں اور اس زمین کی قریب ایک سو مملکتوں میں بسنے والے دو ارب باشندے ہر وقت موت کے سائے تلے سسکیاں لے رہے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ تو اس وقت کی حالت ہے۔ لیکن جب ہم اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیں کہ دنیا میں ہر روز قریب بیس لاکھ انسانوں کا اضافہ ہو رہا ہے تو سوچئے کہ چند سالوں کے بعد یہاں کس قسم کی قیامت برپا ہو جائے گی۔ اس قیامتِ صغریٰ کی کیفیات کو اس نے صرف چار الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا ہے جب کہا ہے کہ یہ مسئلہ نسلِ انسانی کے لئے ''ٹائم بم'' کی حیثیت رکھتا ہے۔ دیر صرف مہلت کے وقفہ کی ہے۔ جب یہ اپنے وقت پر پھٹا تو یہ پوری نسلِ انسانی کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ اسی آنے والی تباہی کے پیشِ نظر پچھلے دنوں ستّر کے قریب ترقی پذیر (Developing) ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ فلپائن کا پریذیڈنٹ اس کا چیئرمین تھا۔ اس نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترقی یافتہ (Developed) مملکتوں کو وارننگ دی کہ اگر تم ان پسماندہ ممالک کو جلد از جلد اپنے ہمدوش نہ لے آئے تو یہ خود تو تباہ ہوں گے ہی، لیکن اپنے ساتھ تم سب کو بھی تباہ کر کے رکھ دیں گے۔ آپ غور کیجئے عزیزانِ من! کہ وہ تباہی جس کے متعلق نوعِ انسان کے محسنِ اعظم ﷺ نے چودہ سو سال پہلے وارننگ دی تھی، کس قدر حقیقت بن کر سامنے آ رہی ہے۔ اس تباہی سے بچنے کے لئے انسانی فکر نے سوشلزم کا نظام وضع کیا تھا۔ اس نظام کی کیفیت یہ ہے کہ ''اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے'' وہ ابھی چار قدم بھی نہ چلنے پایا تھا کہ لڑکھڑانے لگ گیا۔ روس میں تو وہ ناکام ہو چکا ہے۔ اسی ہفتہ خبر آئی ہے کہ وہاں کا نظامِ زراعت اس بُری طرح ناکام ہو رہا ہے کہ وہاں کی مرکزی کمیٹی نے جھنجھلا کر وزیر زراعت کو الگ کر دیا ہے اور ایسا دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہے۔ چین کے متعلق میں نے کچھ عرصہ پہلے کہا تھا کہ اس کی ترقی کا راز ماؤزے تنگ کی شخصیت ہے۔ اس کے بعد آپ دیکھئے گا کہ اس

کا بھی کس طرح شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ وہاں یہ انتشار چواین لائی کی وفات کے ساتھ ہی شروع ہو گیا ہے حالانکہ ماوزے تنگ ابھی زندہ ہے۔ عزیزانِ من! جو نظام بھی شخصیات کے سہارے قائم ہوتا ہے اس میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی سکت نہیں ہوتی۔ نظام وہی قائم رہ سکتا ہے جو غیر متبدل اقدار کی محکم بنیادوں پر استوار ہو۔

مذاہب عالم:

دنیا کے مختلف مذاہب کے علمبردار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس وقت دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے اس کہ وجہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسلیں مذہب سے بیگانہ ہو رہی ہیں۔ مذہب کے ان علمبرداروں میں خود ہم مسلمان بھی شامل ہیں کیونکہ ہمارے ہاں بھی وہ دین موجود نہیں جسے خدا نے مقرر کیا اور حضور نبی اکرم ﷺ نے قائم کر کے دکھایا تھا۔ ہمارے ہاں بھی اسلام بہ حیثیت ایک مذہب ہی کے رائج ہے۔ آج مذاہب کی کیا کیفیت ہو چکی ہے، اس کا نقشہ پروفیسر (Hocking) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> یہ تمام مذاہب ٹوٹی ہوئی کشتیاں ہیں (جنہیں حوادثِ زمانہ کے طوفانوں نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساحل پر پھینک دیا ہے) یہ سب اپنے تقدس کی چادروں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اطمینان خویش نے (جو درحقیقت فریبِ نفس کا دوسرا نام ہے) ان کے متبعین کی آنکھوں میں دھول جھونک رکھی ہے۔ (جس کی وجہ سے انہیں حقیقت نظر ہی نہیں آسکتی) ان کے عقاید و نظریات کے زنگ نے ان کے افکار و اعمال کے قبضوں کو اس قدر جام کر دیا ہے کہ ان میں اب حرکت کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ یہ لوگ قدامت پرستوں کے کوڑوں سے اس قدر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سمجھ اور سوچ سے کام لینے کی جرأت کر سکیں۔ (Living Religions and a World Faith)

دنیا جس طرح اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات سے تنگ آچکی ہے، اسی طرح موجودہ مذاہب سے بھی مایوس ہو چکی ہے۔ کاغذ کے پھولوں سے کوئی کب تک اپنا جی بہلاتا رہے؟ بایں

ہمہ وہ اپنی نجات کا ذریعہ مذہب ہی سمجھتی ہے۔ اس کے لئے انہیں کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے، اس کا تصوّر امریکہ کے ممتاز ماہرِ نفسیات (Erich Fromm) نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے، کہ وہ مذہب۔۔۔

> انسان کی ارتقائی منازل کا ساتھ دے گا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ عالمگیر ہوگا اور منتشر انسانیت کو ایک وحدت میں منسلک کر دے گا۔ جو مشرق و مغرب کی تمام تعلیمات کا مہیمن ہوگا۔ وہ عقل و بصیرت پر مبنی ایسا قابلِ عمل ضابطۂ حیات دے گا جو علومِ سائنس سے ہم آہنگ ہو۔ وہ انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ وہ خارجی کائنات اور خود اپنی ذات کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکے۔ اسی نظام کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ نوعِ انسان کا مذہب بن سکے۔

(The Sane Society)

چونکہ اہلِ مغرب کے ہاں دین کا تصوّر نہیں، اس لئے ان کی زبان میں دین کی قرآنی اصطلاح کے ترجمہ کے لئے بھی کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے پیش کیا ہے اس سے واضح ہے کہ مغرب کے دانشوروں کو ''دین'' کی تلاش ہے، مذہب کی نہیں (وہ تو پہلے ہی مذہب گزیدہ ہیں اور ویسے مذہب کا بنجارہ خود اپنا ٹھاٹھ باٹھ سمیٹ کر رخصت ہونے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ یہ جو اس وقت اس کا دھوم دھڑکا سنائی دے رہا ہے، وہ رقصِ بسمل سے زیادہ کچھ نہیں) لیکن اپنی زبان کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے وہ اسے (Religion) ہی سے موسوم کرتے ہیں۔ دوسری طرف چونکہ خود ہمارے ہاں بھی دین کا تصور نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے، اس لئے ہم بھی اسلام کو ایک مذہب ہی کی حیثیت سے سمجھتے اور اسی حیثیت سے اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مناظرے اور مباحثے:

چنانچہ ہم نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت اسی کو سمجھ رکھا ہے کہ دیگر اہلِ مذاہب کے ساتھ مناظروں اور مباحثوں کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کر دی جائے اور اپنی ان فتح مندیوں پر جشن و مسرت منائے جائیں۔ عام لوگ تو ایک طرف رہے، ہمارے ہاں ایک

شخص۔۔۔مرزا غلام احمد قادیانی نے مامور من اللہ ہونے کا دعویٰ کیا اور اس ماموریت کا مقصد یہ بتایا کہ وہ آریوں اور عیسائیوں سے مباحثے کے ذریعے اسلام کی افضلیت ثابت کرے گا۔ عیسائی پادریوں کو شکست دینے کے لئے اس نے نظریہ یہ پیش کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ اپنے اس کارنامے کو اس نے کسرِ صلیب (صلیب توڑ دینے) سے تعبیر کیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ایک طرف وہ کاسرِ صلیب ہونے کے مُدعی تھے اور دوسری طرف اسی صلیب کی محافظ، سلطنتِ برطانیہ کی اطاعت کو مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار دیتے تھے۔ وہ اپنی ان ظفر مندیوں کا ڈنکا بجاتے، دنیا سے رخصت ہو گئے اور اس کے چند ہی سال بعد پہلی جنگِ عظیم میں صلیب پرستوں نے مسلمانوں کی رہی سہی قوت اور حشمت کا بھی تار د پود بکھیر کر رکھ دیا۔ علامہ اقبالؒ نے اُمتِ مسلمہ کو مذہب پرستی کے اس مقدس فریب سے نجات دلانے کے لئے پاکستان کی آزاد مملکت کا تصوّر پیش کیا تھا تا کہ اس میں پھر سے اسلام کو ایک دین (نظامِ حیات) کی حیثیت سے پیش کر کے، اقوامِ عالم کے اختیار کردہ دیگر نظاموں پر اس کی افضلیت ثابت کر دی جائے۔

مملکتِ پاکستان میں مذہبیت:

لیکن وا حسرتا کہ ان کے اس خواب کو مذہبی پیشوائیت، سرمایہ داری اور ہماری حکمرانوں کی ہوسِ اقتدار نے خوابِ پریشاں کر کے رکھ دیا اور دین کے احیاء کے بجائے یہاں مذہب نے اپنا جال اور بھی شدت اور وسعت سے پھیلا دیا۔ حتیٰ کہ اب یہ پھندے اپنی انتہا کو پہنچ رہے ہیں۔ مذہب کا مقصود انفرادی جذبات کی تسکین ہوتا ہے جسے ''ثواب'' کے غلط مفہوم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مذہب کس طرح جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے، اس کی تازہ ترین مثالیں ہمیں دو ایک حالیہ واقعات سے ملتی ہیں۔ اگلے دنوں پاکستان میں مسجدِ نبوی ﷺ کے امام تشریف لائے۔ انہوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد میں نماز جمعہ پڑھائی تو کم از کم پانچ لاکھ افراد نے ان کی اقتداء میں نماز ادا کی۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ میں جمعہ کی نماز کا اتنا بڑا اجتماع اور کہیں نہیں ملتا۔ یہ ہے بھی قابلِ فہم، حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس واطہر سے ہماری عقیدت ہی نہیں، محبت کا تقاضا ہے کہ جس چیز کی بھی حضور ﷺ کی طرف کسی انداز سے نسبت ہو، وہ

ہمارے نزدیک محبوب اور محترم بن جائے۔ ہم تو مکّہ اور مدینہ طیبہ کی کھجوروں کی گھٹلیوں کو بھی یونہی نہیں پھینک دیتے۔ انہیں بھی زمین میں دفن کر دیتے ہیں کہ پامالی سے ان کی بے حرمتی نہ ہو۔ مسجدِ نبوی ﷺ کے یہ امام مسلکِ اہل حدیث کے پابند ہیں اور اس باب میں نجدی آلِ سعود کی شدّت کا سب کو علم ہے۔ ان کے عقیدہ کی رُو سے مزارات پر گنبد اور قبّے تعمیر کرنا تو ایک طرف، وہ زمین سے ذرا سی اُٹھی ہوئی پختہ قبر کو بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ ان کے اسی مسلک کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے جنت البقیع میں صحابہ کبار رضی اللہ عنہم تک کے مزارات کو زمین کے ساتھ ہموار کر دیا۔ ان امام صاحب نے تو معلوم نہیں اس باب میں کچھ فرمایا تھا یا نہیں، ان کے بعد مسجد حرام (کعبہ) کے امام تشریف لائے تو انہوں نے اسی بادشاہی مسجد میں اپنے خطبۂ جمعہ میں قبروں کو پوجنے یا ان سے کچھ مانگنے کے رجحانات کو سراسر کفر قرار دیا۔ (نوائے وقت، لاہور، 6مارچ 1976ء) بہرحال میں کہہ یہ رہا تھا کہ اس پانچ لاکھ کے مجمع نے اس مسلک کے پابند امام کے پیچھے نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کر لی، اور اس کے بعد وہاں سے اُٹھ کر سیدھے سڑک کے اس پار داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری کے لئے جمع ہو گئے جہاں ان کے عرس کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ اس تقریب میں مزار پر فاتحہ ہی نہیں پڑھی جاتی، اسے گلاب اور کیوڑے سے غسل دیا جاتا ہے۔ اس پر چادریں چڑھائی جاتی ہیں، منّتیں مانی جاتی ہیں، سجدے کئے جاتے ہیں۔ پھر قوالیاں بھی ہوتی ہیں۔ انہی مسلمانوں نے، جنہوں نے اس امام کے پیچھے جو ان تمام بدعات کو کفر اور شرک سمجھتا تھا، نماز ادا کر کے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا تھا، (یعنی ثواب حاصل کیا تھا) داتا صاحب کے عرس کی ان رسومات میں شریک ہو کر بھی اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا۔ مذہب میں یہی کچھ ہوتا ہے اور طرفہ تماشہ یہ کہ جس حکومت کے زیرِ اہتمام بادشاہی مسجد کا اجتماع منعقد ہوا تھا اسی کے زیرِ انتظام عرس کی یہ تقریبات بھی سرانجام پا رہی تھیں۔ کیونکہ امورِ مذہبی اور اوقاف دونوں حکومتِ پاکستان کے زیرِ تحویل ہیں۔ ان دونوں سے آگے بڑھ کر مجھے اس اضافہ کی اجازت بھی دیجئے کہ اسی شام جناح باغ کے اوپن ایئر تھیٹر میں روسی طائفہ کے ناچ گانے کا تماشہ بھی ہوا اور عجب

نہیں کہ مملکت کے کسی وزیر نے اس کا بھی افتتاح کیا ہو۔ یہ سب کچھ اس مملکت میں ہوا اور ہو رہا ہے، جس کے آئین میں اسلام کو مملکت کا مذہب قرار دیا گیا ہے۔ اگر مملکت کا ''مذہب'' نہیں۔۔۔''دین'' اسلام ہوتا تو اس میں اس قسم کی بوالعجبیوں کی گنجائش کیسے ہو سکتی تھی؟

اسلام وعظ بن گیا:

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مذہب میں دین، وعظ بن کر رہ جاتا ہے۔ اس کی مثالوں کی بھی کچھ کمی نہیں۔ آپ حضرات میں (نوجوانوں کو چوڑیے) جو ذرا عمر رسیدہ ہیں وہ اگر اپنے حافظہ پر زور دیں گے تو انہیں یاد آجائے گا کہ وہ بچپن سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو جائے تو ان پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہ آسکے۔ یہ وعظ مسجدوں اور اسٹیجوں سے بڑھتے بڑھتے عالمگیر اجتماعات تک آپہنچے۔ دو سال قبل اسی لاہور میں مسلم ممالک کے سربراہوں کی ایک مہتم بالشان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ہر مملکت کے نمائندہ نے مسلمانوں کے اتحاد اور اُمّت کی وحدت پر خطبات دیے، قرار دادیں پاس ہوئیں اور اس کے بعد یہ تمام سربراہ اسی طرح متفرق اور منتشر ہو گئے جس طرح اس کانفرنس میں شرکت سے پہلے تھے۔ اب اسی شان وشوکت سے سیرت کانگریس منعقد ہو رہی ہے جس میں مسلمانوں کی مختلف مملکتوں کے قریب ایک سو ممتاز مندوب شرکت فرما رہے ہیں۔ اس میں بھی ہر ایک کے خطاب کا مقطع کا بند یہ سنائی دیتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے چودہ سو برس قبل عالمی انسانی برادری کا جو تصوّر دیا تھا اگر آج دنیا بھر کے مسلمان اس پر عمل کریں، تو مسلمان قوم پوری دنیا پر حاوی ہو سکتی ہے۔ بحوالہ (نوائے وقت، 6 مارچ 1976ء)، سیرت کانگریس کے اجتماعات میں حسبِ معمول نہ صرف غلبہ اسلام کے لئے دعائیں مانگی گئیں بلکہ مرکزی حکومت پاکستان کے مذہبی امور کے وزیر (مولانا) کوثر نیازی صاحب نے یہ اعلان بھی فرما دیا کہ:

> 1976ء کا سال پاکستان کے لئے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ بلکہ یہ
> سال غلبہ اسلام کا سال ہے اور اس سال عالم اسلام کو کامل اتحاد نصیب ہوگا۔
> اس سال باطل کی تمام قوتیں انشاء اللہ شکست کھائیں گی۔

(نوائے وقت، لاہور، 6 مارچ، 1976ء)

اس پر یقیناً نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے ہوں گے اور جن کے گوش نصیحت نیوش ہوں گے، انہوں نے مسجد سے ملحق مزارِ اقبالؒ سے اٹھتی ہوئی یہ دردناک صدا بھی سن لی ہوگی کہ:

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اُنہیں پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں انہیں

ٹوئن بی کا انتباہ:

ہم (معاف بفرمائید) مذہب کے برگِ حشیش کے رسیا، اس قسم کے سنہرے خوابوں میں مدہوش رہنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ دانشور، جن کی نگاہیں حقائق پر ہیں، دیکھئے کہ وہ ہمارے متعلق کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ ٹوئن بی عصرِ حاضر کا سب سے بڑا نامور مؤرخ ہے۔ وہ نیشنلزم پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> مغرب میں بعض دوسرے تصوّرات بھی ہیں جن کا باعثِ فوز و فلاح ہونا بے حد مشکوک ہے۔ ان میں سے ایک ہماری نیشنلزم ہے۔ ترک اور بعض دیگر اسلامی مما لک بھی نیشنلزم کے تصوّر سے اسی طرح متاثر ہوتے جا رہے ہیں جس طرح او رمغربی تصوّرات سے۔ ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہئے کہ جن مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان، بلالحاظ اختلافِ نسل، رنگ، زبان، عادات وغیرہ محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھائی بھائی ہیں، ان میں بھی اگر نیشنلزم کا ایسا تنگ نظر عقیدہ رائج ہو گیا تو دنیا کا حشر کیا ہوگا؟ آج جبکہ مغربی صنعت کاری کی وجہ سے دنیا میں فاصلہ کا تصوّر آہستہ آہستہ مٹتا جا رہا ہے۔۔۔ مسلمانوں کا اخوتِ باہمی کا عقیدہ، یقیناً مغرب کی تنگ نظر قومیت پرستی کے عقیدہ سے کہیں بہتر ہے او ریہی عقیدہ موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے۔ برعکس مغربی عقیدہ کے جس نے یورپ میں، محض قومیت کے معیار پر، درجنوں آزاد مملکتوں کو پیدا کر رکھا ہے، جن میں سے ہر ایک دوسری سے الگ ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یورپ کی جو حالت ہو چکی ہے، اس میں یورپ کے اندر کم و بیش چالیس آزاد

مملکتوں کا وجود ایک ایسا بڑا خطرہ ہے جس کا کوئی علاج ہی نہیں ہوسکتا۔ (خود یورپ کی تباہی کا تو یہ عالم ہے لیکن) یورپ کی تہذیب نے لوگوں کی آنکھوں کو ایسا چندھیا دیا ہے اس کے تصوّراتِ حیات کو آنکھیں بند کر کے اپنائے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں کم از کم مسلمانوں سے تو یہ توقع رکھنی چاہیئے کہ وہ اپنے عالمگیر مؤدت و اخوت کے تصوّر کو چھوڑ کر یورپ کا ایسا تنگ نظری کا تصوّر اپنے ہاں رائج نہیں کریں گے۔ ایک عالمگیر برادری کا تصوّر، ویسے تو فلاحِ انسانی کے لئے ہمیشہ ضروری رہا ہے، لیکن اس ایٹم کے دور میں اس کی اہمیت اور ضرورت اور بھی شدید ہوگئی ہے۔(The World and the West)

دانشورانِ مغرب تو ہم سے یہ توقعات وابستہ کرتے ہیں اور ہماری یہ حالت ہے کہ کوئی مسلم مملکت اپنی جداگانہ قومیت کو چھوڑ کر، وحدتِ اُمّت کی طرف ایک قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ ایسے، وعظ ان سے جتنے جی چاہے کرالو۔

ایک سوال:

میرے ہاں عزیزانِ من! مغرب کے اکثر مفکرین و مصنفین آتے رہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے اسلامی نظام کے اساسی عناصرِ ترکیبی پیش کرتا ہوں تو وہ کہا کرتے ہیں کہ ہمیں ان نظریات کے قابل قبول ہونے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن ہمارے اس سوال کا آپ کے پاس کیا جواب ہے کہ مسلمان ان نظریات کو اپنے ایمان کی بنیاد قرار دیتے ہیں، لیکن کیا آپ بتائیں گے کہ سارے عالمِ اسلام میں کسی ایک مسلم ملک میں بھی یہ نظام عملاً قائم ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے تو فرمایئے کہ جب آپ اس نظام کو خود اپنے ہاں قائم نہیں کرتے یا قائم نہیں کر سکتے تو دنیا کو اس کی دعوت کس منہ سے دے سکتے ہیں؟ میں تو ایک طرف، ان کے اس سوال کا جواب نہ ہماری سربراہی کانفرنس دے سکتی تھی نہ سیرت کانگریس، نہ ہی وہ حکومت جس کے زیرِ اہتمام اس قسم کی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔ ہم اس سوال کا جواب کیا دے سکیں گے، جو خود اپنی مملکت میں بھی ایمان کے اشتراک کی بنیاد پر ایک قوم نہیں بن سکے! عزیزانِ گرامی قدر! یاد رکھئے کسی

نظریہ کو محض وعظ ونصیحت کے ذریعے نہیں پھیلایا جا سکتا۔ اسے اگر عملی نظام کی شکل میں قائم کر دیا جائے تو اس کے خوشگوار نتائج دنیا کے لئے وجہ کشش بن جاتے ہیں۔ خود حضور نبی اکرم ﷺ نے مکّہ میں تیرہ برس تک قرآنی نظریات کی تبلیغ فرمائی اور اس کی بڑی ضرورت تھی کیونکہ آپ ﷺ کے مخاطبین میں سے کوئی بھی ان نظریات کو ماننا تو ایک طرف، پہچانتا تک نہیں تھا۔ لیکن اس طریق سے تیرہ برس کے عرصہ میں ایک قلیل سی تعداد اسلام کی طرف آسکی۔ مگر جب اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے مخلص اور صادق متبعین کی رفاقت سے اسلام کو بہ حیثیت ایک دین کے قائم کر دیا تو چند سال کے عرصہ میں **دُخلُوۡن فِیۡ دِیۡنِ اَفۡوَاجًا** کی عملی تصویر دنیا کے سامنے آگئی اور پھر جب یہ نظام ذرا آگے بڑھا تو عہدِ فاروقی رضی اللہ عنہ میں وہ ایران سے مصر تک ایک بحرِ موّاج بن گیا۔ یوں دنیا فوج درفوج، دین کے حصار میں داخل ہوئی۔ اب بھی اگر کسی ایک خطۂ زمین میں یہ نظام عملاً قائم ہو جائے تو آپ دیکھئے گا کہ اقوامِ عالم جو اپنے بنائے ہوئے نظاموں سے اس درجہ تنگ آچکی ہیں، کس طرح لپک کر اس کی طرف بڑھتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر عقل کے تجرباتی طریق کی سست رفتاری سے ایسا ہوگا اور نہ معلوم اس میں زمانہ کو اور کتنی کروٹیں بدلنا اور نوعِ انسان کو کس قدر ہولناک تباہیوں میں سے گزرنا پڑے گا کہ اس کے سوا اس کی فلاح ونجات کی کوئی شکل نہیں ہوگی۔ گوئٹے نے اپنے دوست (Eckermann) کے نام اپنے خط میں کس قدر صحیح لکھا تھا کہ:

> اسلام کی تعلیم کبھی ناکام ثابت نہیں ہوسکتی۔ ہم اپنے تمام نظام ہائے حیات کے باوجود اس سے آگے جا ہی نہیں سکے اور حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔ (بحوالہ خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی ہے حضور ﷺ کے نبیٔ آخرالزمان ہونے کا مطلب اور ختم نبوّت کا مفہوم۔ حضور ﷺ کی رسالت زمان ومکان کی حدود سے ماورا ہے۔ دنیا کے آخری انسان کے لئے بھی حضور ﷺ ہی رسول ہیں۔ جو اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتا اور کسی دوسرے ظہور یا اس کے امکان کو تسلیم کرتا ہے، رسالتِ محمدیہ ﷺ پر اس کے ایمان کا دعویٰ باطل ہے۔ اس کا شمار اُمّتِ محمدیہ ﷺ

میں نہیں ہوسکتا۔ یہ میرا ایمان ہے عزیزانِ گرامی قدر! اور اسی ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہونے کی میری آرزو ہے۔

یا رب ایں آرزوئے من چہ خوش است!

میں نے اسی قسم کے ایک اجتماع میں اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ عصرِ حاضر کی بے پناہ تاریکیوں میں نظامِ محمدی ﷺ ہی وہ روشنی کا مینار ہے جو کشتی انسانیت کو ساحلِ مراد کی نشاندہی کرسکتا ہے۔ انسان کا موجودہ عالمگیر اضطراب، مایوسیوں کا مقامِ مرگ نہیں، اُمیدوں کی نشیدِ حیات ہے۔ یہ وہ خزاں ہے جو آنے والی بہار کے لئے طائرِ پیش رس ہوتی ہے۔ وہ آخرِ شب کی تاریکی ہے جس کے متعلق غالب نے کہا تھا کہ:

مژدہ صبح در این تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

مفہوم: مجھے اس تاریک رات میں صُبح کی خوشخبری سُناتے ہیں۔ (گویا رات بھر جلنے والے) چراغ کو بجھاتے ہیں اور آفتابِ عالم تاب کے اُبھرنے کے آثار دکھاتے ہیں۔ (م۔س۔ا)

دیکھنا یہ ہے کہ اس خورشید جہانتاب کی پہلی کرنوں کی جبیں بوسی کی سعادت کس خطۂ زمین کے حصّے میں آتی ہے۔ جس کے نصیب میں یہ سعادت ہوگئی، اسی کی قسمت میں نوعِ انسان کی امامت (Leadership) ہوگی۔

اور یہی ہے طلوعِ سحر کی وہ یقین آفریں اُمید جس کی وجہ سے، میں بھی یہ کہتے ہوئے اس پیکرِ محبوبیت کا دامن تھامے بیٹھا ہوں کہ:

ترے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو　　میں ترے در سے جو اُٹھوں تو کس کے در جاؤں؟

ان اللہ وملئکۃ یصلون علی النبی یٰأیھا الذین امنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیما (33:56)

پرویز

(مطبوعہ، طلوع اسلام اپریل 1976)

ملاحظہ ہو مضمون ''مثلہ معہ'' جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔

اس وقت ''تلخیص'' ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ان حوالوں کے لئے ہم محترم عرشی صاحب کے مضمون کے شکر گذار ہیں۔

تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد سوم (تاریخ رسالت) عنوان ''حضرت ابراہیمؑ''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک کے متعلق تو دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے)۔ اس لئے اپنے اس ''مسلمہ'' میں عہد نبوی کو تو شامل نہ کیجئے۔ بعد کا ذکر کیجئے۔

یہ حدیث بڑی دلچسپ ہے سنئے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک باغ میں تشریف فرما تھے کہ آپ کے پاس حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جا پہنچے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جاؤ جو شخص ملے اسے یہ بشارت دے دو کہ جس نے کہہ دیا لا الہ الا اللہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس آئے تو سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملے اور انہیں وہ بشارت سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو زور سے تھپڑ رسید کیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھاگے بھاگے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی پیچھے پیچھے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تھپڑ کی ضرب سے رو رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واقعہ پوچھا اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ اسے کیوں پیٹا ہے۔ انہوں نے کہا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت دی ہے۔ فرمایا ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ ایسا نہ کریں مبادا لوگ سست ہو جائیں۔ انہیں کام کرنے دیجئے۔ فرمایا بہت اچھا۔ ہم لوگوں کو کام کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ (مسلم)